علی یاسر

اسسٹنٹ ڈائر یکٹر،اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

منظور عارف کی شاعری میں سماجی طرزِ احساس اور ترقی پسندی

Ali Yasir

Assistant Director, Pakistan Academy of Letters, H-8/1, Islamabad.

"SOCIAL SENSE AND PROGRESSIVISM IN THE POETRY OF MANZOOR ARIF"

Manzoor Arif (1924-1980) was an important poet of Urdu. He was attached with Progressive Writers Movement in a very active way. He wrote his Ghazals and Nazms in Urdu language and published in the major literary journals of his age. He used to write in Chachi Language too in the forms of Poems, Ghazals and Geets. He was a saint by nature and felt the pain of mankind all his life. He is an important poet of social improvement and sensitivity. Progessive ideas, humanism and socio political shades can be seen ideas in his poetry. Manzoor Arif caught eyes of important critics, literary personalities and journals of his period in respect of his excellent poetry. His poetry is full of emotions and love. In this research article the life, poetry and poetic idealogy of Manzoor Arif is presented with examples. Social progress and social issues are raised in his poetry. Famous writers and critics also wrote about his social sensibility and progressive approach which is also expressed in this article. His poetry compiles the history of his life which belongs to different social, political and geographic ways. His one book was published named "Lehr Lehr Darya" His Ghazals and Nazms represent the betterment of his countrymen and progressive idealogy in an impressive way. He is an important poet and writer of his age and his poetry should not be forgotten.

منظور عارف یکم ستمبر ۱۹۲۴ء کو اپنے ننھیال حضرو (ضلع اٹک) میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام منظور الٰہی رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں معاشی، سیاسی اور سماجی بحران عروج پر تھے۔ ہندوستان میں پہلی جنگِ عظیم کے اثرات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ برصغیر میں ایک طرف آزادی کی تحریک زور

پکڑ رہی تھی تو دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسعت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ فرقہ واریت، جاگیر دارانہ ماحول، مذہبی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں کی ریشہ دوانیاں عام تھیں۔ منظور عارف کا ددھیال صوبہ سرحد جبکہ ننھیال صوبہ پنجاب کے علاقے حضرو میں واقع تھا اور دونوں علاقوں سے انھیں خاص تعلق تھا۔ دونوں علاقوں کے تہذیبی پہلوؤں نے ان کی شخصیت کی تربیت پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ دورانِ تعلیم ہی انھوں نے ٹھان لی تھی کہ زندگی کسی مقصد کے تحت بسر کرنی چاہئے۔ مذہبی و روحانی تربیت نے انھیں شعورِ حیات بخشا۔ ان کی ذات پر سب سے زیادہ اثرات ترقی پسند تحریک کے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سماجی طرزِ احساس نمایاں ہے۔

سماجی مساوات اس بات کی متقاضی تھی کہ مقامی سطح پر استحصالی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جائے اور علاقائی زبانوں کو بلند مرتبہ دلانے کے لیے تحریر و تصنیف کے ذریعے کام کیا جائے۔ اس زمانے میں ان کے احباب جو اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے اور جنھوں نے بعد میں بہت شہرت پائی ان میں فتح محمد ملک، شورش ملک، شفقت تنویر مرزا، منو بھائی، وقار بن الٰہی، تسلیم عارفی (منظور عارف کے بھائی)، کنور خالد محمود، خاور رضوی، عنایت الٰہی ملک اور انوار فیروز وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر احباب اس وقت کیمبل پور کے تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم تھے۔ منظور عارف اس وقت تک علمی اور ادبی سطح پر مصروف و معروف ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء کا زمانہ منظور عارف کی بھرپور ادبی صلاحیتوں کے اظہار کا دور تھا۔ وکالت سے قبل وہ ایک ملازمت کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے پیشہ وارانہ وکالت چھوڑ کر پریس اینڈ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر ملازمت شروع کی اور ان کی پہلی تعیناتی کراچی میں ہوئی۔ وکالت چھوڑنے میں ان کی ذات کی صداقت، دردمندی اور نفاست پیش پیش تھی۔ کراچی قیام کے دوران ان کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ وہ اس مرکزی مقام سے دور چلے گئے تھے جس نے انھیں ایک شاعر اور دانش ور کے طور پر مستحکم کیا تھا۔ منظور عارف عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ تیسری مرتبہ ۳۰ نومبر ۱۹۸۰ء کی رات تقریباً دس بجے انھیں دل کا دورہ پڑا اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

انھوں نے کیمبل پور، راولپنڈی اور کراچی قیام کے دوران اپنے لوگوں کو مجبور و بے بس دیکھا جس سے ان کی شاعری میں سماجی ہمدردی کا جذبہ کار فرما رہا۔ وہ ترقی پسند تحریک سے نظریاتی طور پر ہمیشہ منسلک رہے۔ یہی ترقی پسندانہ سوچ تھی جو انھیں معاشرتے میں مثبت تبدیلیوں اور فرد کی زندگی میں بہتری کے جذبے سے سرشار کیے ہوئے تھی۔ منظور عارف بھی اس دور کی سیاسی رقابتوں کی بھینٹ چڑھے۔ منظور عارف کو ملازمت سے معطل کر دیا گیا تھا۔ وہ اٹک واپس آ گئے اور اپنے بیوی بچوں سمیت بے روزگاری کے عفریت سے دوچار ہوئے۔ انھوں نے یہاں آ کر دوبارہ وکالت کا آغاز کرنے کی کوشش کی لیکن نہ تو وہ اپنے مزاج کو بدل سکتے تھے اور نہ ہی خدمتِ انسانی کو تجارت بنا سکتے تھے۔ اس مرتبہ جب وہ راولپنڈی آئے تو پھر یہیں ان کی مستقل سکونت ہو گئی جہاں وہ اپنی موت تک زندگی کے کوہسار سے جوئے شیر نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ منظور عارف نے یہ ملازمت تو حاصل کر لی تھی لیکن یہاں پر بھی انھیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چیمبر آف

کامرس بھی تاجروں کا ادارہ ہے۔ اپنی ترقی پسند سوچ کے باعث منظور عارف ایسے طبقات سے ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکے تھے جن کے لیے مادی مفادات ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی خود داری، آزاد روی اور درویشی بہت عزیز تھی۔ نتیجتاً ایک دن اچانک یہ ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ اس ملازمت کے خاتمے کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

> " اس ملازمت کے خاتمے کا باعث ایک مشاعرہ بنا۔ ان دنوں احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے تعلقات میں کچھ کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ احمد فراز اور رشید قیصرانی نے یہ کوشش کی کہ احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے درمیان مصالحت کرا دی جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک مشاعرہ منعقد کرایا جس میں منظور عارف کو بھی دعوت دی۔ یہ مشاعرہ پشاور میں منعقد ہوا۔ مشاعرے کے دوسرے دن چیمبر آف کامرس کی ایک میٹنگ تھی جس میں شہر کے سرکردہ تاجروں نے اکٹھا ہونا تھا۔ منظور عارف اس میٹنگ میں نہ پہنچ سکے۔ دوسرے دن جب منظور عارف دفتر آئے تو خورشید صاحب (خورشید سنیما کے مالک) جو چیمبر آف کامرس کے صدر تھے منظور عارف سے کہنے لگے کہ آپ کا بہت انتظار کرتے رہے لیکن آپ نہیں آئے جس کی وجہ سے میٹنگ نہ ہو سکی۔ انھوں نے دو تین مرتبہ منظور عارف سے یہ شکایت کی۔ منظور عارف نے ان سے کہا کہ آپ کی نظر میں میں ایک قابل احترام رکن نہیں تھا جو اس میٹنگ میں شریک ہوتا۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس پر منظور عارف غصے میں آئے اور بولے کہ میرے پاس کوئی کار نہیں، نہ ہی بنگلہ اور نہ ہی کوئی سنیما ہے بلکہ میرے پاس تو صرف عزتِ نفس ہی ہے اور میں اسے مجروح نہیں ہونے دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنی سائیکل لے کر گھر چلے آئے۔ جب انھوں نے چیمبر کی ملازمت چھوڑی تو ان کی تنخواہ تین ہزار روپے تھے"۔ (۱)

اس کے بعد کے دن انھوں نے تعمیر اور جنگ میں کالم لکھ کر اور معمولی سے مشاعروں کے بل بوتے پر زندگی گزاری۔ روزنامہ تعمیر میں وہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ ۱۹۶۶ء میں انھیں ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں سکرپٹ رائٹر کی ملازمت مل گئی۔ کراچی کی طرح یہاں بھی انھیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔ ان کی یہ ملازمت ان کی وفات تک برقرار رہی۔ یہ ان کی زندگی کا تیسرا اور آخری دور تھا۔ ریڈیو کی ملازمت نے انھیں فکرِ معاش سے آزاد کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ملازمت سے ان کے ادبی ذوق کی تشفی بھی ہوتی جا رہی تھی۔ ریڈیو ملازمت کے دوران انھوں نے تقریباً سو ڈرامے لکھے۔ گیت، فیچر اور دیگر ادبی پروگراموں کے اسکرپٹ اس کے علاوہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں سماجی ترقی اور دردمندی واضح طور پر جھلکتی ہے۔ انھیں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت سے بہت لگاؤ تھا۔ دونوں میں قلمی اور بالمشافہ گفتگو بھی ہوتی رہتی تھی۔ قاسمی صاحب منظور عارف کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے اور انھیں حقیقی ترقی پسند شاعر سمجھتے تھے۔

ان کا دل اپنے ہم وطن اور پسے ہوئے طبقوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ منظور عارف کی عملی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو رہنما اصول انھوں نے اولین زمانے میں وضع کیے تھے ان سے عمر بھر انحراف نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد اس نظریے سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ ان کے احباب اور ناقدین بھی ان کی اصول پسندی کا دم بھرتے تھے۔ احسن علی خان لکھتے ہیں:

> ''وہ خاموش خاموش سادہ لباس، قلندر منش، خوبصورت انسان سالہا سال ریڈیو پاکستان سے منسلک رہنے کے باوجود اپنا سیلف پروجیکشن نہیں کیا۔ وہ جیسے شہرت سے بھاگتا تھا۔ ریڈیو کے مشاعرے کراتا تھا اور خود غزل نہیں پڑھتا تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ احسن بھائی کچھ نئے شعر ہوئے ہیں آپ بھی سن لیں۔ وہ چھپتا بھی کم تھا۔ میں نے اس کی چند ہی چیزیں پڑھیں تھیں اور ان کی بنیاد پر اپنے ذہن میں ان کا ایک اونچا مقام متعین کر لیا تھا''۔ (۲)

جس زمانے میں منظور عارف مصروفِ شعر و ادب تھے وہ بلا شبہ ترقی پسند تحریک کے عروج اور مقبولیت کا زمانہ تھا۔ مقصدیت کو شعر و ادب کا مرکزہ قرار دیا جاتا تھا۔ ترقی پسند ادباء و شعراء ایک علمی اور سماجی انقلاب کے لیے کمربستہ تھے۔ تحریک کے ختم ہونے کے بعد ترقی پسندوں کی تعداد بہت قلیل رہ گئی۔ منظور عارف ایک ایسے اہلِ قلم تھے جو تادمِ مرگ اپنی سماجی حساسیت، ترقی پسندی اور مقصدی تحریروں میں مصروفِ عمل رہے۔ انھوں نے شاعری کو اپنے کسی مفاد یا چرچے کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اپنے نظریات کے پرچار کے لیے کوشاں رہے۔ اپنے نظریاتی اور ترقی پسندانہ پس منظر کے باعث وہ اپنی ذہنی ہم آہنگی کے حامل رسائل و جرائد میں ہی چھپتے تھے۔ کراچی میں قیام کے دوران وہ صرف ''افکار'' میں چھپتے تھے اور جب احمد ندیم قاسمی نے فنون کا اجراء کیا تو اپنی شاعری انھیں باقاعدگی سے بھیجتے رہے جو شائع ہوتی رہی۔ اسی طرح مشاعروں میں شرکت بھی بہت کم کرتے جو سراسر ان کی ذاتی پسند پر مبنی ہوتی تھی۔ زندگی کی اونچ نیچ، حالات کی تلخی اور زمانے کی بے اعتنائی نے کبھی بھی انھیں اپنے اصولوں سے انحراف کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی سوچ کے زاویے کو برقرار رکھا۔ عملی اور ادبی زندگی میں ہمیشہ اپنے اصولوں پر قائم رہے۔

ریڈیو پاکستان میں منظور عارف کی سماجی خدمات، عوام دوستی اور مزدور پروری کی مثال دی جاتی تھی۔ جب ۱۹۷۴ء میں سٹاف آرٹسٹوں کی یونین سازی ہوئی تو انھوں نے منظور عارف سے ہی رابطہ کیا۔ سٹاف اور آرٹسٹوں کے دیرینہ مطالبات کے لیے بنائی گئی یونین کے پہلے صدر کے طور پر بھی منظور عارف کو منتخب کیا گیا۔ ملازمین کے تحفظ، مراعات اور آرٹسٹوں کی سہولیات کے حوالے سے انھوں نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ جدوجہد کرکے اپنے مطالبات منظور کرا لیے۔ انھوں نے اپنی تمام عمر اصولوں کے تحت بسر کی۔ کبھی جبر کی حمایت نہ کی اور کبھی باطل سے ذاتی مفاد کے حصول بارے نہ سوچا۔ انھوں نے درویشی اور ترقی پسندی کو اپنے لیے مشعلِ زیست بنایا۔ انھوں نے اپنے نظریات کے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرتے ہوئے اپنی مرضی سے زندگی بسر کی۔

بیسویں صدی جنگوں، انقلابات، آزادی، عالمی تبدیلیوں اور فکری ترفع کی صدی تھی۔ صنعتی عہد، مادی زاویے، ادبی اقدار کی جدت، اور تغیراتِ زمانہ نے دیگر علوم و فنون کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پر بھی گہرے نقوش مرتب کیے۔ ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں اور تضادات کا دور دورہ تھا۔ یہاں کے نوجوان کارل مارکس کے نظریات سے متاثر ہو رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک ادبی منظر نامے پر غالب تھی۔ منظور عارف کی تعلیم و تربیت کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے جب برصغیر میں تحریکِ آزادی زور و شور سے جاری تھی۔ ان کی شاعری کے جوہر گارڈن کالج میں تعلیم کے دوران ہی کھل چکے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں فکری اور فنی ارتقاء وقوع پذیر ہوتا رہا۔ منظور عارف ایک سماجیاتی طرزِ احساس کے شاعر تھے۔ احمد ندیم قاسمی نے ان کے واحد شعری مجموعے ''لہر لہر دریا'' کے دیباچے میں منظور عارف کے فنی اور فکری مؤقف پر بحث کرتے ہوئے ترقی پسند ادب کے نظریاتی مرکز کو ان کی شاعری کا منبع قرار دیا:

> ''منظور عارف ترقی پسند مصنفین کی صف کا ایک ایسا سربرآوردہ رکن ہے جس نے کسی بھی دور میں اپنے فنی مؤقف کو مصلحت کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔ اس نے اپنے فن اور اپنے حلقۂ اثر میں ترقی پسند ادب کی اس تحریک کو زندہ رکھا جس کی نظریاتی قوت کو تاریخِ ادب سے خارج کر دیا جائے تو بڑے بڑوں کو قدم جمانے کے لیے زمین نہ ملے'' (۳)

شاعری کے ساتھ ساتھ منظور عارف عملی طور پر بھی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے ایک فعال رکن اور علاقائی سطح کے عہدیدار تھے۔ یوسف حسن کے بقول:

> ''منظور عارف انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل پاکستان کانفرنس (منعقدہ لاہور) میں بطور مبصر شریک ہوئے تھے۔ ان ہی کی کوششوں سے ۱۹۵۲ء میں اٹک میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوئی تھی جس کے ارکان میں غلام جیلانی برق، شفقت تنویر مرزا، شورش ملک، منو بھائی اور تسلیم عارفی شامل تھے''۔ (۴)

منظور عارف نے ہوش سنبھالا تو ترقی پسند تحریک کے نظریات و اثرات عام تھے۔ وہ بھی کارل مارکس کے فلسفے کے قائل ہو گئے اور شاعری کے آغاز سے ہی ان نظریات کا پرچار کرنے لگے۔ سماجی بدحالی، معاشی اور سیاسی بحرانوں سے دوچار بیسویں صدی کی یہ تیسری دہائی ابھی پہلی جنگِ عظیم کے زخموں سے چُور تھی کہ اس پر دوسری عالمی جنگ کے خطرات منڈلانے لگے تھے۔ ساری دنیا میں معاشی بحران عروج پر تھا۔ برصغیر میں سیاسی و فرقہ وارانہ فسادات شدت پکڑ رہے تھے۔ ان تمام حالات سے اس دور کی نسل براہِ راست متاثر ہو رہی تھی اور ان تاریخی و سیاسی مسائل سے دوچار تھی۔ پھر تقسیمِ ہندوستان اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی سیاسی انتشار عوام کی زندگیوں کو مشکل بنا رہا تھا۔ سیاسی ہنگامہ خیزیوں، استحصال اور فسادات کے اس دور میں ترقی پسند تحریک کی صورت میں لوگوں کو ایک روشنی کی کرن نظر آ رہی تھی۔ دیگر ادیبوں اور شاعروں کی طرح منظور عارف نے بھی ترقی پسند تحریک کو اپنا ادبی محور بنا لیا تھا۔ ابتدائی زمانے میں منظور عارف کی شاعری پر

رومانی اثرات تھے۔ کالج کے ماحول، نوجوانی کے جذبات اور خواب دیکھنے کی عمر کے باعث ان کی شاعری میں وصل و ہجر اور فراق و غم کی کیفیات ملتی ہیں۔

میرے جذبات، میرے احساسات
رات بھر دم انہی کا بھرتے ہیں
میری بیدار خواب گہ کے چراغ
رات بھر انتظار کرتے ہیں
ہر نئی رات بیت جاتی ہے
صبح تک وہ مگر نہیں آتے
دل تو کہتا ہے لوٹ آئیں گے
وہ مگر لوٹ کر نہیں آتے (انتظار)

ان کی شاعری میں رومانیت پسندی کا یہ عنصر زیادہ دیر تک قائم نہ رہا اور اس کی جگہ سماجی دردمندی اور ترقی پسندانہ پہلوؤں نے لے لی۔ فیضؔ، ساحرؔ، مجازؔ، اور دیگر ترقی پسندوں کی طرح ان کی شاعری میں بھی رومانیت ترقی پسندی کی تلخی میں مدغم ہونے لگی۔ نظم ''تجدید'' کا یہ بند ملاحظہ ہو:

تیرے سینے میں یہ جاں سوز امنگوں کی جلن
تیری بے نور سی آنکھیں، ترے ماتھے کی شکن
تیرے الجھے ہوئے گیسو، ترے سوکھے ہوئے لب
تیری مدقوق جوانی، ترا کمزور بدن
میری پونجی، مری دولت، مرا سرمایہ ہے (تجدید)

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر منظور عارف کا سیاسی و سماجی شعور پنپ چکا تھا اور شاید اسی باعث وہ قیامِ پاکستان کے بعد وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ لاہور میں ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔ منظور عارف کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے شفقت تنویر مرزا نے لکھا:

''اس ہنگامی دور میں اس (منظور عارف) نے ملک کے راہنماؤں پر بھی نظمیں لکھیں اور رسول اکرمؐ کی ذاتِ اقدس کو مخاطب کرتے ہوئے ملک کے 'اسلامی معاشرے' کے گھناؤنے ناسوروں پر نشتر چلائے۔ یہ نشتر زنی اتنی کامیاب رہی جتنی ادب میں ترقی پسند تحریک''۔ (۵)

منظور عارف نے دوسرے مسلمانوں کی طرح گھر میں مذہبی ماحول دیکھا تھا۔ گھر کی دیہاتی فضا نے انھیں اخلاقی قدروں اور دردمندی کی طرف مائل کیا۔ ان کی اردو اور چھاچھی شاعری میں سماجی امتیاز اور غریبوں کے ساتھ روا بدسلوکی

کے خلاف ایک مزاحمت کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ ان کے نوجوانی کے دور میں اقبالؒ کی شاعری آزادی، حرکت و عمل اور ربطِ ملت کی آئینہ دار بن کر سامنے آئی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر انھیں تحریک پاکستان سے بہت دلی تعلق ہو گیا۔ ان تمام حقائق کی بنیاد پر حالات نے انھیں زمینی اور تہذیبی اقدار سے مستفید کیا۔ انھوں نے ترقی پسند ہونے کے باوجود مذہب سے استواری قائم رکھی۔ اپنے مذہب اور نبیِ رحمتؐ سے انھیں انتہائی لگاؤ تھا۔ پروفیسر فتح محمد ملک کے بقول:

> ''کرم اے شہِ عرب و عجم، راہبر اور شاعرِ ارضِ وطن انجمن ترقی پسند مصنفین کی انتہا پسندی کے اس دور میں شائع ہوئی تھیں جب متشدد قسم کے ترقی پسند نظریہ ساز رسول اکرمؐ کی مدح میں لکھی گئی نظموں کو مجنونانہ مذہبی احیائیت اور ہمارے قومی راہنماؤں کی شان میں لکھی گئی نظموں کو رجعت پسندانہ فرقہ واریت قرار دیتے تھے''۔ (۶)

منظور عارف کی شاعری کا یہ انداز ہمیں پاکستان کے قیام کے بعد کے کچھ برسوں میں اس سیاسی منظرنامے کی طرف متوجہ کرتا ہے جو سیاسی نااہلیت کے باعث پراگندہ ہو رہا تھا۔ منظور عارف نے مذہب اور تہذیب کی آڑ میں وہ علامتیں استعمال کیں ہیں جن سے عوام اور حکمران دونوں طبقوں کا تعلق تھا۔ منظور عارف بنیادی طور پر ترقی پسند نظریات ہی کو سیاست اور معیشت کا حل سمجھتے تھے لیکن ناپسندیدہ ماحول کو محض مسترد کر دینا کافی خیال نہیں کرتے تھے۔ وہ کسی نہ کسی حوالے سے سماج میں مثبت تبدیلیوں کے لیے کوشاں تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے مسلمان ہونے کے احساس سے سرشار رہتے اور اپنی سرزمین سے بے پناہ محبت کا دم بھرتے تھے۔ مذہب کی آڑ میں لوگوں کو ظلم و ستم اور غربت و افلاس سے دوچار کرنے کے بھی وہ مخالف تھے۔ روزنامہ امروز میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلام میں مسئلہ جبر و قدر شروع ہی سے انتہائی نزاعی مسئلہ رہا ہے۔ حادثۂ کربلا کے بعد جس امید نے پہلی بار ضرورت کے ماتحت جبر کو قسمت کا لکھا ثابت کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہے۔ لیکن حضرت حسن بصری سے جب اس بارے میں استفسار کیا گیا تو انھوں نے ایسے لوگوں کو جھوٹا قرار دیا۔ یونانی فلسفہ جو جبر کا قائل تھا صدیوں تک اسلام پر اثرانداز رہا اور اس افیون سے اسلامی معاشرہ غنودگی اور خواب کی سی کیفیت میں مبتلا رہا''۔ (۷)

منظور عارف کی وہ نظمیں جو انھوں نے پیغمبرِ اسلامؐ یا دوسرے قومی رہنماؤں پر لکھیں محض حمد و ثنا پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان نظموں کے موضوعات طبقاتی کشمکش اور سماجی انصاف کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ سرمایہ داری، ملوکیت، جاگیرداری اور استحصال کے خلاف ان کا لہجہ مذہبی اور تہذیبی اقدار کے قریب تر تھا۔ منظور عارف نے اپنے شعری اور فنی سفر میں پاکستان کی بدلتی ہوئی سیاست اور پاکستانی معاشرے پر مرتب ہونے والے اثرات پر گہری نظر رکھی ہے۔ منظور

عارف کی سیاسی بصیرت اور مثبت ترقی پسندی کا اعتراف انھیں ایک سچے دانش ور کے طور پر تسلیم کراتا ہے۔ انھوں نے ایسے شعر یوں ہی تخلیق نہیں کیے تھے بلکہ یہ ان کی قلبی واردات کا اظہار تھا:

دیوانوں کے دو ہی مقام آزادی یا تختۂ دار
تجھ پہ قربان اے غمِ دوراں تُو مری زندگی کا حاصل ہے
انکارِ حقیقت ترے دیوانوں نے اے دوست صحرا میں کیا تھا نہ سر دار کیا ہے
رخصت غمِ یار کو تو کر لوں آیا غمِ روزگار! آیا

قیامِ پاکستان سے ۱۹۵۸ء تک منظور عارف کی شاعری پر ترقی پسند تحریک کے مقاصد اور موضوعات کے ساتھ ساتھ پاکستان کے سیاسی انتشار اور بدحالی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ اس ضمن میں ''کرم اے شہِ عرب و عجم''، ''راہبر''، ''شاعرِ ارضِ وطن'' اور دیگر نظمیں اس عہد کے سیاسی و سماجی منظر نامے پر بحث کرتی ہیں۔ فارغ بخاری ادبیاتِ سرحد جلد سوم ۱۹۵۳ء میں لکھتے ہیں:

'' عارفؔ ذہین اور بالغ نظر نوجوان ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور نئی اقدار سے بہرہ ور ہے۔ انھوں نے تقسیم سے پہلے غیر ملکی حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کو دیکھ کر کہا۔

صحنِ گلشن اجاڑنے والے اک کلی اور مسکرائی ہے

تقسیم کے بعد آزادی کے سحر سے مسحور ہونے والوں کو متنبہ کیا۔

یہ صبح نہیں تیرگیٔ شب کے دلارو تاروں کی ضیاء نے تمھیں بیدار کیا ہے'' (۸)

اس دور کی شاعری میں منظور عارف نے ''ریڈ کلف'' اور '' یادگار شہیداں'' جیسی سیاسی نظمیں لکھیں جو ان کی انگریز حکمرانوں کی مکاریوں اور چیرہ دستیوں سے نفرت کا برملا اظہار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی وہ نظمیں جن میں تحریک پاکستان سے وابستہ توقعات کا اظہار ہے اپنی تاریخ اور دھرتی سے گہرے لگاؤ اور محبت کا پتہ دیتی ہیں۔ اسی حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک رقم طراز ہیں:

'' جو چیز عارفؔ کو اپنی پود کے شاعروں سے منفرد اور ممتاز بناتی ہے وہ قومی تاریخ اور آزادی کے امکانات سے ان کا تخلیقی شغف ہے۔ اس باب میں ترقی پسندوں کے بنے بنائے مفروضوں کو عارف ایک شانِ ترقی پسندی کے ساتھ رد کرتے ہیں''۔ (۹)

ان کی نظموں میں قیامِ پاکستان کے بعد بھی طبقاتی کشمکش، سماجی بے انصافی، سرمایہ داری، ملوکیت اور جاگیر داری کے خلاف ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ نظم شاعرِ ارضِ وطن میں وہ کہتے ہیں:

تُو نے جس دور کی دیکھی تھی خیالی تصویر
تو نے جس ارضِ مقدس کی رکھی تھی بنیاد

تو نے جس دیس کے دیکھے تھے سنہرے سپنے
تو نے جو ملک تصور میں کیا تھا آباد
آج وہ ملک تو اک زندہ حقیقت ہے مگر
دستِ بے رحم سیاست کی وہی ہے بیداد
وہی فاقہ کشی، ناداری و عریاں بدنی
وہی نالہ، وہی زاری، وہی آہ و فریاد
چند کو چھوڑ کے جو شخص ہے فریادی ہے
شاعرِ قوم! بتا کیا یہی آزادی ہے (شاعرِ ارضِ وطن)

اسی طرح کے جذبات کا اظہار ان کی نظموں ''احتجاج''، ''راہبر''، ''کرم اے شہِ عرب و عجم'' وغیرہ میں بھی ملتا ہے۔ ان کی شاعری ان کی نظریاتی وابستگی کا واشگاف اظہار بن جاتی ہے۔ زندگی اور فن کے بارے میں وہ ہمیشہ سے اپنے اصولوں پر کاربند رہے۔ غمِ جاناں کا احساس کم ہے جبکہ غمِ دوراں کا رنگ غالب ہے۔ اسی طرح کے مضامین ہمیں ان کی غزلوں کے شعروں میں ملتے ہیں:

آہٹ بھی کوئی پا نہ سکے گھر سے یوں نکل ہر سمت دیکھ بھال کوئی دیکھتا نہ ہو
سایہ بھی ساتھ لے کے نہ جا کوئے یار میں ہمزاد بھی سفر میں کہیں رونما نہ ہو
غمِ دوراں بھی نہیں ہے غمِ جاناں بھی نہیں سخت مشکل میں ہے یہ دل کہ غمِ جاں بھی نہیں
میں عیاں ہو کے زمانے میں ہوا ہوں رسوا تو جو پردے میں ہے اب تک تری دانائی ہے
چلتا ہے دو قدم وہ ادھر دو قدم ادھر اس کا یہی چلن ہے یہی اس کی چال ہے
یہاں رہتا کوئی خود سر بڑا ہے کہ دیواریں ہیں چھوٹی در بڑا ہے
ایک وہ دن کہ تری دید پہ قرباں تھی نگاہ ایک یہ دن کہ ترے وصل کا ارماں بھی نہیں
جانے عرش سے کب کوئی پیغام مری جاں پر اترے جانے کب ان دیکھا جلوہ قلبِ پریشاں پر اترے

ترقی پسند شعراء کی صف سے عارفؔ کا گہرا تعلق تھا لیکن علی سردار جعفری یا اس طرح کے دوسرے سخت گیر اشتراکی ناقدین سے انھیں انحراف تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ارتقائی سفر کو جاری رکھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ان کی غزلوں کے مزاج میں جدت، وسعت، نئے نئے امکانات کی تلاش اور تازہ کاری کے حسین نمونے ملتے ہیں۔

نشے میں حقیر تھا زمانہ میں جیسے پہاڑ پر کھڑا تھا
آرزو ہے کہ بنوں میں دریا اور تو مجھ پہ ہو ابن کے چلے
میں محوِ خواب تھا کہ مرے من کی ایک موج اٹھی اور اس کے بندِ قبا تک پہنچ گئی

وادیٔ عشق سے اٹھی ہے تو کیا لائی ہے میری آواز ہی کہسار نے لوٹائی ہے

اس دور میں نئی غزل اور نئے رجحانات کی شاعری جدید شاعری کے زمرے میں بہت مقبول ہو رہی تھی۔ نئی علامتوں، استعاروں، آہنگوں اور لسانیات کے استعمال سے شاعری کو وسعت اور نئے معانی مل رہے تھے۔ منظور عارف نے اپنے دوسرے دور کی نظموں میں بھی فلسفیانہ طرزِ فکر سے کام لیا۔ ان کی نظمیں پتھر کی سوچ، شہ پارہ، منجمد راز، ایک خواب، بے بسی، رسائی، آس کی پیاس، پیپل کا درخت، یارِ خورشید صفت وغیرہ ہمارے معاشرے اور ماحول کی پیداوار ضرور ہیں لیکن ان کا علامتی اور استعاراتی پیرایہ انسان کی ذاتی تنہائی اور آفاقی دکھوں کا آئینہ دار بھی بن گیا ہے۔ اسی زمانے میں اردو میں نئی نظم کی تحریک کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ منظور عارف فنِ شاعری اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح آگاہ تھے، وہ کسی سے پیچھے کیوں رہتے۔ اس لیے داخلیت اور خارجیت کے امتزاج سے شاعری کرنے لگے۔ دروں بینی کے عمل اور فکر و فلسفہ سے استفادے نے ان کی نظموں اور غزلوں کو جدید شاعری کا نمائندہ بنا دیا تھا۔ اس زمانے کے بعد ان کی شاعری کے تیسرے عہد میں ان کی غزل کچھ اور نکھر گئی تھی۔ زندگی کی رنگینیوں اور تجربوں سے متعلق وہ اپنے مشاہدات کو شعر بنا دیتے ہیں۔ نئے امکانات کی تلاش کے ساتھ ساتھ روایت کے شعور نے ان کی شاعری کو بہت حسین بنا دیا تھا۔ سیاسی ماحول سے تعلق، عشق کے جذبے کی حلاوت، کائنات کی مابعد الطبیعیات اور انسان کے نفسی محرکات ان کی شاعری کے پیمانوں میں ڈھلنے لگے۔ یہ چند اشعار ان کے متنوع موضوعات اور انداز کا پتا دیتے ہیں:

سمٹوں تو اشکِ آرزو ہوں پھیلوں تو محیطِ بے کراں ہوں

میں قطرۂ آب سے بنا موج کیا بحر کے اور کام آؤں

میں جن بلندیوں پہ تھا جن سے گرا بھی تھا میرا خیال ہے کہ وہاں پر خدا بھی تھا

میں ہوا بن کے گزرتا رہتا تم جو بہتے ہوئے دریا ہوتے

اپنی صورت دیکھ رہا ہوں بہتے پانی میں دیکھو کیسے قائم ہوں دریا کی روانی میں

میں نے تنہائی سے تنگ آ کے اسے یاد کیا اب مرے ساتھ ہی رہتا ہے خدا زنداں میں

رات جسے ہم ڈھا کر سوئے گہری چین کی نیند جب اٹھے تو وہیں کھڑی تھی وقتِ سحر دیوار

میں پتا تھا خزاں میں گر گیا تھا وہ اک ٹہنی تھی کٹ کر بھی ہری تھی

پتے یہ گر رہے ہیں کہ قدموں کی چاپ ہے اے دل ٹھہر ٹھہر مرے آنگن میں کون ہے

دیکھو تو دار دار پہ حق ہے چڑھا ہوا عیسیٰ صلیب پر ہے کلیساؤں میں نہیں

میں شب کا راج دلارہ سحر سے ڈرتا ہوں بچاؤ صبح کا سورج نہ دیکھ پائے مجھے

کیا جانیے کن لوگوں کی قسمت میں ہیں عارفؔ وہ پھل جو ابھی شاخِ شجر تک نہیں پہنچے

منظور عارفؔ نے زندگی میں بہت سے واقعات و سانحات دیکھے تھے۔ جنگِ عظیم دوئم، تقسیمِ ہندوستان کے فسادات، مارشل لاء، بھٹو کی پھانسی، مشرقی پاکستان کی علیحدگی وغیرہ۔ ان حالات و واقعات نے ان کی طبیعت پر بہت گہرے نقوش مرتب کیے۔ ان کی شاعری میں جہاں دردناک لہجہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے وہیں مزاحمتی شعور بھی سر اٹھاتا ہے۔ ۱۹۷۵ء کے بعد کے سیاسی جدوجہد کے زمانے کے ہر رخ پر منظور عارف نے اپنی شاعری میں ردعمل کا اظہار کیا۔ بھٹو صاحب کی تحریک کی ناکامی پر انھوں نے تنقید بھی کی جو اس عہد کو بہت قریب سے دیکھنے کا اشارہ ہے:

کہا نہ تھا کہ زمانے کے راستے میں نہ آنہ دے اسے کوئی الزام ہے زمانہ خدا
کہا نہیں تھا کہ تاریخ کے عمل کو نہ روک بلندیوں کو نشیبوں کی سمت مت لے جا
یہ پوچھو بت سے ہو تخلیق کس کی خدا گر بت ہے تو آذر بڑا ہے
اڑائے پھرتی ہے انسان کو فکر پرندے سے تو اس کا پر بڑا ہے

فکر کی ندرت، احساس کی شدت، تخیل کی وقعت ان تمام چیزوں کے امتزاج سے ان کی شاعری بھری پڑی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کا دکھ اور تکلیف ان کے دل پر نقش تھی۔ ان کی شاعری کا تیسرا دور اسی زمانے سے شروع ہوا۔ نئی علامتوں، استعاروں اور موضوعات کی بدولت وہ جدید تر غزل تک پہنچ گئے تھے۔ اپنے سیاسی و سماجی شعور کا اظہار انھوں نے اس نزاکت سے کیا ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس دور کی غزلوں کے شعروں میں دکھ اور رنج کی کیفیات واضح ہیں۔ اظہارِ حقیقت میں غزل کا اظہار انھیں آفاقیت کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس دور کے شعروں میں کرب، پشیمانی، حزن و ملال، اپنوں کی بے وفائی اور غیر ذمہ داری کا احساس نمایاں ہے۔

اِک عمر کی داستانِ گریہ دریا کے سوا کسے سناؤں
اِس نے زمین پر بھی نہ جینے دیا مجھے یہ شیوۂ سزا جو خدا کو روا بھی تھا
رات تاریک تھی میدان میں چھپ کر سوئے لیکن اب کیا ہو کہ کرنوں نے ہے لشکر ڈالا
جب کڑی دھوپ کا خورشید سروں پر چمکا اپنے ہی سایوں کو صحرا میں گریزاں دیکھا
زنداں میں ایک عمر سے آباد ہیں مگر اب تک سمجھ نہ پائے کہ ہیں کس گناہ میں
صبح دم ختم ہو گیا عارفؔ جو بھروسہ نئی سحر پر تھا
یہ کیا ہوا ہے یہ منظر ہے کیا نگاہوں میں گھروں سے لوگ نکل آئے شاہراہوں میں
نووارد انِ کوئے تمنا، رہے خیال قرضے تمھارے سر پہ ہمارے لہو کے ہیں
کیوں سرِ دار ہوں سچ کہہ کر میں بت کدہ، کعبہ، کلیسا بولے
وہ ایک لمحہ سرِ دار جو چمک اٹھا اس ایک لمحے پہ قربان ساعتیں ساری
جہاں پہ دفن ہے اس کے بدن کا تاج محل ادھر دریچے رکھیں گی عمارتیں ساری

یہ اور ان کے علاوہ کتنے ہی شعروں کے مطالعے سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ منظور عارف نے سیاسی لحاظ سے ایک ہنگامہ خیز عہد میں شاعری کی۔ اپنے لڑکپن میں ہی وہ اقبال، حالی، اکبر وغیرہ کو پڑھ چکے تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی ان کی شاعری کو ترقی پسندی کی شاہراہ پر لے آئی۔ مختلف ادوار کے سیاسی اور معاشرتی حالات ان کی شاعری میں آشکار ہیں۔ انھوں نے ساری زندگی عظمتِ انسان، آزادیٔ بشر اور معاشرتی اقدار کی بحالی کی وکالت میں گزار دی۔ ترقی پسندی اور معاشرتی ترفع ان کی شاعری کے مقاصدِ زریں قرار پاتے ہیں۔

ترقی پسندانہ انداز فکر کو پیش کرنے میں بھی وہ غزل کے مزاج کی نفاستوں اور لطافتوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ سیاسی اور سماجی شعور کے اظہار میں بھی وہ اپنے نظریات پر قائم رہتے ہیں۔ ترقی پسندوں پر ہونے والی تنقید سے بھی وہ آگاہ رہتے ہیں۔ یہ شعر ان کی سوچ کا آئینہ دار ہے۔

ہم نے غمِ دوراں سے اگر پیار کیا ہے حُسنِ رخِ جاناں سے کب انکار کیا ہے

ہر عہد کا اپنا اندازِ فکر، مزاج اور تقاضے ہوتے ہیں۔ منظور عارف اپنے عہد کے نئے رویوں اور رجحانات سے الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے سامنے زندگی، کائنات، حسن، غمِ جاناں و دوراں بہت واضح مشاہدات کی صورت اختیار کرتے گئے۔ ان تجربات و حالات کا انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا ذکر بھی کیا ہے۔

بے نیازِ سکونِ منزل ہے زندگی ارتقا پہ مائل ہے
گم ہے یوں فکرِ کائنات میں دل یادِ محبوب سے بھی غافل ہے
فن فقط حسن کو نہیں کہتے اس میں خونِ جگر بھی شامل ہے
تجھ پہ قربان اے غمِ دوراں تو مری زندگی کا حاصل ہے

جدتِ شاعری کے سفر پر انھوں نے اپنی فکر کو استعاراتی اور علامتی انداز دیا۔ آغاز سے ۱۹۵۸ء تک کے زمانے میں ان کی غزل ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ہے۔ علامتیں، استعارے اور موضوعات وہی ہیں جو ترقی پسند تحریک کے منشور کو بیان کرتے ہیں۔ تیرگی، کرنیں، شب، سحر، زندان، صبح، رات، دریا وغیرہ جیسی علامتوں کی مدد سے انھوں نے اپنے جذبے اور احساس کو شعری پیرہن عطا کیا ہے۔

اِس شب کی تیرگی میں جو طائر خموش ہیں صحنِ چمن میں دھوم مچائیں گے صبح دم
عارف مزدوروں کی محنت میں پوشیدہ کتنے راج محل ہیں کتنے تاج محل ہیں
آؤ کرنوں کی کھوج میں نکلیں تیرگی سے نباہ مشکل ہے

ایسی کتنی ہی مثالیں ہیں جن سے ان کی شاعری کی علامتیں، استعارے اور جذبے کا اظہار واضح اور گداز لہجے میں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ رمز و کنایہ اور علائم کی صناعی بھی برتتے ہیں۔

منظور عارفؔ کی غزلوں کے شعر ہماری تہذیبی اور سیاسی تاریخ کے پرتو ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی غزل ایمائیت اور جدید تلازمہ کاری کا حسین مرقع بنتی گئی۔ ترقی پسندانہ عناصر کی خوبصورتی کا اعتراف ان کی شعری عظمت کا ثبوت ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمیؔ:

> " حق کا اعلان کرنا اور حق کا احساس بیدار کرنا ہی ترقی پسند فنکاروں کا منصب ہے اور منظور عارف نے یہ منصب اپنے انفرادی اسلوب میں فنِ شعر کے جملہ جمالیاتی مطالبات کے احترام کے ساتھ پورا کیا ہے"۔ (۱۰)

غزلیاتِ منظور عارف میں اور بھی کئی مقامات پر ایسے استعارے اور علامتیں بہت حسن و خوبی سے برتنے پر ہم منظور عارف کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی غزل میں جو دوسرا معروف موضوع ہے وہ عظمتِ انسان، رواداری، انسان دوستی اور معاشرتی احساس کا ہے جو یقیناً انھیں درویش مزاجی اور ترقی پسند تحریک سے ودیعت ہوا تھا۔ ان کی غزل کو روایت و جدت کا ایک حسین اور دلکش امتزاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ مرکبات، تلمیحات، تشبیہات اور الفاظ کے چناؤ میں انھوں نے بہت مشاقی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ ایک صاحبِ مطالعہ شخص تھے، حساس شاعر تھے، دردمند ترقی پسند تھے اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان تھے۔ موضوعات کے تنوع نے ان کی غزل کو ہمہ رنگ اور ہمہ جہت بنا دیا ہے۔ کائناتی مسائل، انسانی المیے، معاشرتی سانحات، دم توڑتی آرزوئیں، انسانی اقدار کی معدومی وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو ان کی غزل کو عالمی تناظر میں اپنے عہد کی عکاس صنفِ ادب بنا دیتے ہیں۔ ان کی غزل ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ جمالیاتی مظاہر سے بھی بھرپور اور رومانیت کی مہک سے لبریز ہے۔ وہ ایک حساس اور متفکر شاعر تھے۔ سماجی طرزِ احساس، درویشی اور ترقی پسندی کے امتزاج سے ان کی شاعری انتہائی دل کش ہے۔ نظم احتجاج کا بند ہے۔

مانتا ہوں کہ تجھ سا جہاں میں کوئی بھی نہیں
لیکن اے ربِ کون و مکاں
یہ جہاں!
یہ جہاں تیری جاگیر ہے ملکیت ہے تری تو بتا اس میں انسان دن رات فاقوں سے مرتے ہیں کیوں؟
دن میں سو بار جو بیچتے ہیں تجھے تیری جاگیر میں وہ ہمیشہ سنورتے ہیں کیوں؟
بات کیا ہے کہ منعم کی گردن ترے آستانے پہ جھکتی نہیں
تیغ مظلوم کی شاہ رگ پر بھی رکتی نہیں
سوچتا ہوں تو ہے بھی کہیں
یا نہیں (احتجاج)

پھر نظم کرم اے شہِ عرب و عجم میں لکھتے ہیں:

ہوا کچھ ایسا جہاں پر ملوکیت کا نزول
کہ دب کے رہ گئے انساں کی زندگی کے اصول (کرم اے شہِ عرب و عجم)

سیاسی، سماجی اور ادبی حوالے سے منظور عارفؔ کی ایسی ہی نظموں کے بارے میں جمیل ملک نے لکھا:

''منظور عارف کے پہلے دور کی ان نظموں میں ایک ایسے نوجوان کا احتجاج ملتا ہے جو ''شہِ عرب و عجم، راہبر قوم اور شاعرِ ارضِ وطن کے بتائے ہوئے راستے پر بڑے خلوص سے گامزن ہے۔ مگر جس کے روبرو انہی رومانی، سیاسی اور فکری و فنی راہنماؤں کے نام لیواؤں نے اس طرح اسلامی جدیدیت اور بھائی چارے کے نام پر ملوکیت اور شہنشاہیت کے تاج پہن رکھے ہیں کہ بے رحم سیاست کی اس بیداد گری میں خلقت فاقہ کشی، ناداری، عریاں بدنی کے ایسے آشوب مسلسل میں مبتلا ہے کہ ایک نئے وطن میں نئے تقاضوں کا خواب سلطانیٔ جمہور کے عصرِ نو کے ابھرتے ہی ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا ہے''۔ (۱۱)

ملک اور قوم کے بارے میں منظور عارفؔ کی فکر مندی، حالات کی زبوں حالی، سرمایہ داروں کے استحصال پر ان کا کرب اور آزادیٔ اظہار پر پابندی ان تمام نظموں میں آشکار ہے۔ ایک سچا فنکار اور لکھاری اپنے ارد گرد سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ نظموں میں ترقی پسندیت کا رنگ غالب ہے۔

نظر میں کیسے سمائے چمن کی رنگینی
خزاں کے خوں سے ہے آلودہ آستینِ بہار
اٹھا لیا ہے بلندی کا بار پستی نے
وگرنہ خاک میں مل جاتا رفعتوں کا وقار (جائزے)

بادل کو کیسے زنجیریں پہناؤ گے
آندھی کو کیسے پھونکوں سے روک سکو گے
کیسے چھین سکو گے تم مہتاب سے ٹھنڈک
تاروں کی آنکھوں کو کیسے بند کرو گے (روک تھام)

ان نظموں میں جبر و استبداد کے ہتھکنڈوں کو ایک شکست خوردگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اپنی کتاب میں انھوں نے شاعری کے دوسرے دور میں جو نظمیں مرتب کیں ان میں سے یارِ خورشید صفت، پیپل کا درخت، آس کی پیاس، رسائی، بے بسی، شہ پارہ، ایک خواب دو رخ، منجمد راز، پتھر کی سوچ اور جمخانہ کلب شامل ہیں۔ ان تمام نظموں میں سے جمخانہ کلب ایک واقعاتی نظم ہے جبکہ باقی تمام نظمیں ان کے مخصوص ترقی پسند اسلوب کی حامل ہیں۔ نظم جمخانہ کلب میں انھوں نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے تناظر میں قومی و ملی آزادی کا احساس اجاگر کیا ہے۔ دوسرے دور کی نظمیں پہلے دور کی نظموں سے قطعی

مختلف اسلوب کی حامل ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے حادثات و واقعات انھیں نظمیں لکھنے پر ابھارتے ہیں۔ تیسرے دور کی نظموں میں بھی انھوں نے اپنے ترقی پسند رویے کو قائم و دائم رکھا ہے۔

شہر لاہور میں جمخانہ ہی جمخانہ نہ تھا
اس میں داتا بھی تھا اقبال بھی پیمانہ ہی پیمانہ نہ تھا
اہلِ دل بھی تھے، قلندر بھی تھے، درویش بھی تھے
جنھیں کچھ اور ابھی مرحلے درپیش بھی تھے
میں تھا سرشار تو کیا
تھا مگر اتنا گنہگار نہ تھا
میں بھی داتا ہی کا دم بھرتا تھا (جمخانہ کلب)

عالمی سازشوں، اقوام متحدہ کے دوہرے کردار، امریکہ کی بالادستی کی خواہش، پاک بھارت جنگ اور قوموں کی ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لیے جدوجہد کو انھوں نے نظموں میں بہت عمدہ علامات کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ نظم ''وٹو پاور'' میں انھوں نے اقوامِ متحدہ پر تنقید کی اور آمرانہ برتری کی ریشہ دوانیوں کو اجاگر کیا۔ نظم ''ویت نام روحوں کا مسکن'' اور ''آئینے کے داغ'' اور ''قبلۂ اول'' مشرق وسطیٰ کے تناظر میں تحریر کی گئی تھیں۔ تیسرے دور میں انھوں نے بین الاقوامی واقعات کے تناظر میں لکھی گئی نظموں کے علاوہ جو استعاراتی اور جدید نظمیں تخلیق کیں ان میں اکلوتی خواہش، پیمانۂ تنہائی، میں سوچتا ہوں، ڈروں اکیلی، دوجی تپسیا کب ہوگی، پسند ناپسند، موت سے موت ڈرے، سوئے لمحے، رسمِ دنیا، خالق اور مالک اور، آرزوؤں کا بھگوان، آرزو کا سفر اور صبح کا بادل شامل ہیں۔ یہ تمام نظمیں متنوع الموضوع اور منفرد پیرائے میں تحریر کی گئی ہیں۔ غزل کے مقابلے میں نظم احساسات و جذبات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس لیے مقصدی ادب کے لیے یہ ایک بہترین وسیلہ ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے نظم کو بہت عروج بخشا۔ فیض، راشد، علی سردار جعفری، قاسمی وغیرہ نے آزاد نظم کو بہت ترقی بخشی۔ منظور عارف نے آغازِ شاعری سے ہی ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کیے اور ان کے منشور یعنی مقصدی ادب کے تحت اپنی تخلیقات ڈھالیں۔ منظور عارف نے نہایت واقعاتی نظمیں لکھتے وقت بھی فنی ضرورتوں کو بالائے طاق نہ رکھا۔ خیالات و افکار کے لحاظ سے ان کی شاعری ترقی پسندیت سے بھرپور تھی۔ احمد ندیم قاسمی کے بقول:

> ''یہ درست ہے کہ عارف نے اپنے نظریہ میں اپنی ذات کو کبھی قلم زد نہیں کیا۔ سچی اور صحیح ترقی پسندی نے اہلِ فن سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنی انفرادیت کو اجتماع میں گم کر دیں کیونکہ ترقی پسند شاعر کی ذات تو اس کے نظریۂ حیات کی برکت سے اس زمین کے ایک ایک

فرد کی ذات کا انکشاف بن جاتی ہے اور یوں ایک علامت کا کام دیتی ہے۔ مگر وہ اپنی ذات کے اسرار کدے میں ایسا مبہوت بھی نہیں ہوتا کہ اپنے گرد و پیش کو فراموش کر دے''۔ (۱۲)

قاسمی صاحب کی رائے کے مطابق منظور عارف نے اپنی ذات کو گم نہیں کیا، نہ ہی اس نے ترقی پسندیت کی مقصدیت کو فراموش کیا۔ موضوعات کی سطح پر بھی وہ اپنی روایت سے مربوط نظر آتے ہیں۔ وہ ترقی پسندی کا پیغام بھی مذہبی، تہذیبی اور زمینی حوالوں سے دیتے ہیں۔ نظمیہ شاعری کے پہلے عہد میں انھوں نے زیادہ تر پابند نظمیں لکھیں لیکن ہیئت کے تجربات بھی کیے۔ نظم ''احتجاج'' میں ہیئت کی تبدیلی کا تجربہ کیا ہے۔ مصرعوں کو اقلیدسی طریقے سے لکھا۔ ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ ان میں احساسِ جمال بھی اپنے عروج کو پہنچا ہوا ہے۔ نظم ''کیفیات'' بھی جذبات نگاری اور حسن پرستی کی عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے رومانی راستے پر چلتے ہوئے فکری منزل پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ جمیل ملک رقم طراز ہیں:

''اگرچہ ادب کی ترقی پسند تحریک ایک نظریاتی تحریک ہے لیکن اکثر شعراء کے ہاں رومانیت کے واسطے سے بھی اس تحریک میں شامل ہونے کا رویہ ملتا ہے۔ منظور عارف اپنی نظموں میں اس رویے سے دست کش تو نہیں ہو سکا تاہم پہلے دور میں عذرا کا خوبصورت سراپا سونے چاندی کی بھینٹ چڑھا کر شاعر کے آئندہ شعری سفر میں جلد ہی اس کے فکری و فنی آئیڈیل میں متشکل ہو جاتا ہے۔ یوں اس کا فنی پیکر بھی در حقیقت اس کے فکری قالب ہی کا تخلیقی اظہار بن جاتا ہے''۔ (۱۳)

منظور عارف نے فکری اور فنی سطح پر اعتدال برتا ہے۔ وہ کہیں بھی متشدد نہیں ہوتے۔ ان کے اعتدال انگیز رویے کا اعتراف بہت سے نقادوں نے بھی کیا ہے۔ انھوں نے شاعری میں ترقی پسندی کو کسی فیشن، نعرے یا ادبی سیاست کے لیے اختیار نہیں کیا بلکہ نظریاتی طور پر منسلک ہونے کے باعث ترقی پسند ادب سے مربوط ہوئے۔ ان کے پورے ادبی سفر میں ان کے رویے میں نہ تو کوئی تبدیلی آئی اور نہ ہی اس میں فرق محسوس کیا گیا۔ وطن دوستی اور انسان دوستی ہمیشہ سے ان کی شاعری کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ انسان دوستی کے حوالے سے وہ قومی شعور کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی شعور سے بھی بہرہ ور ہوتے ہیں۔

منظور عارف کی شاعری کے اجتماعی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے اصولوں یا نظریات پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ اپنے لوگوں کی ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھے اور انھیں جینے کے سلیقے سے آگاہ کیا۔ جس نظریاتی وابستگی کے تحت انھوں نے شاعری شروع کی آخر تک اسی پر کاربند رہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں کبھی بھی قومی امنگوں، سماجی تبدیلیوں اور فنی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ فنی معاملات میں وہ ارتقاء کے قائل تھے جبکہ ہیئت کے تجربات سے انکار بھی نہیں کرتے تھے۔ استعاراتی اور علامتی انداز کو شاعری کی شناخت سمجھتے تھے۔ وقت کے ہنگاموں اور تحریکوں سے گھبرا کر کبھی انھوں نے روایات اور مذہبی اقدار سے منہ نہیں موڑا۔ ترقی پسند ادب کی مقصدیت ہمیشہ ان کے

پیش نظر رہی مگر انھوں نے اعتدال کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا۔ اپنی شاعری کے ذریعے پاکستانی قوم کے تہذیبی پس منظر سے قوت حاصل کرکے انھوں نے ایک ترقی پسندانہ قومی سوچ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انسان کے ساتھ انھوں نے اپنا رشتہ ہمیشہ مستحکم اور مضبوط رکھا۔ جنگ، ظلم، استحصال اور جبر سے انھیں نفرت تھی۔ شاعری کے آخری دور میں انھوں نے اپنی نظموں یکم مئی، جم خانہ کلب، آئینے کے داغ، وٹو پاور اور قبلۂ اول جیسی نظموں کے ذریعے انسانی عظمت و وقار کو اجاگر کرنے کی سعی کی۔ مارشل لاء، گھٹن، سماجی پسماندگی کے دور میں بھی انھوں نے امید اور روشنی کے امکان کو روشن رکھا۔ بحیثیت مجموعی منظور عارف کی نظم ہر عہد میں فنی اور فکری ارتقاء پر مائل رہی اور انھوں نے ایک ایسے لہجے کو اپنایا جو دلنشین بھی ہے اور تازہ بھی۔ اپنے عہد کے شاعروں کے ساتھ ساتھ بعد میں آنے والے شاعروں میں بھی وہ اپنی نظمیہ شاعری کے ذریعے ایک الگ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

منظور عارف کی شاعری سماجی ترقی، انسان دوستی، جنگ سے نفرت، جاگیر داری نظام سے بغاوت اور سیاسی ریشہ دوانیوں کے مضامین سے عبارت ہے۔ سیاسی مضامین ان کی شاعری میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ بطور ترقی پسند استحصالی قوتوں سے نفرت ان کے خمیر میں شامل تھی۔ وہ عام آدمی کی زندگی کو آسودہ و خوشحال دیکھنا چاہتے تھے اور انھیں تمام قسم کی زنجیروں سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ سیاسی اور تہذیبی پس منظر پر ان کی دور اندیشی اور عمیق نظر سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ماضی و مستقبل کے متعلق مکمل طور پر وابستہ تھے۔ ہم وطنوں کی لاچاری، محکومی، پسماندگی اور محرومی کا روگ ان کی روح کو کھا رہا تھا۔ عالمی قوتوں کے استعماری اور آمرانہ رویے کو انھوں نے اپنی شاعری میں برملا آشکار کیا۔

شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منظور عارف پچاس کی دہائی میں ابھرنے والی آوازوں میں ایک اہم ترقی پسند شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی درویش صفتی اور اصولی ترقی پسندی سے کبھی پہلو تہی نہ کی۔ غزلوں اور نظموں میں ترقی پسندیت، جدت، روشن خیالی اور امن دوستی کے پہلو اجاگر ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد سے مربوط رہتے ہوئے حالات و واقعات کو خوبصورتی سے بیان کیا۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے عام آدمی کے مسائل بیان کیے اور ان کی ترقی کے خوابوں کو اجاگر کیا۔ انھوں نے ساری عمر ترقی پسندی اور انا پروری میں گزاری۔ مادی منفعت پر اصولی مؤقف کو ترجیح دی۔ ان کی اردو اور چھاچھی شاعری ان کے فقر و غنا اور ترقی پسندانہ فکر کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کی شاعری ان کے عہد کی سچی عکاسی بھی ہے اور آئندہ زمانوں کے لیے مشعلِ راہ بھی کیونکہ انھوں نے کبھی اصولوں پر سمجھوتا نہ کیا۔ منظور عارف نے قلم کو حق و صداقت کے لیے رواں رکھا۔ ان کے نظریات کی اساس ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے پر تھی۔ ساری زندگی انھوں نے توکل و فقر میں گزاری۔ شاید وہ ترقی پسندوں میں واحد شاعر ہیں جن کی شاعری میں روحانیت اور ترقی پسندی دونوں توانا افکار یکساں طور پر موجود ہیں۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر اس سے استفادہ اور لطف کی دونوں صورتیں نکلتی ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے سماج کا احساس اور اس کی ترقی کے خواب دیکھے۔ اپنے شاعری

میں انھوں نے اپنے لوگوں کو ان کے حقوق اور معاشرتی اقدار کے فروغ کے لیے جدوجہد کی۔ انسان دوستی، سماجی احساسات، فلسفۂ تصوف اور ترقی پسندی کو جس انداز میں منظور عارف نے اپنی شاعری میں بیان کیا اس کی مثال ملنا محال ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد جاوید، بالمشافہ انٹرویو ۳/ دسمبر ۲۰۱۰ء، شام آٹھ بجے، بمقام خانۂ احمد جاوید، آئی ٹین فور، اسلام آباد

۲۔ احسن علی خان، ''عرفانِ عارف'' مطبوعہ سہ ماہی ''فنون''، شمارہ اگست۔ ستمبر، ۱۹۸۳ء، ص ۵۷

۳۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ ''لہر لہر دریا''، مطبوعات لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۱۴

۴۔ یوسف حسن، کالم ''قوس در قوس''، روزنامہ امروز، اشاعت ۲۳ جون، ۱۹۸۸ء

۵۔ شفقت تنویر مرزا، منظور عارف، فنون، جلد۔ ا، شمارہ ا۔ ۲، مئی۔ جون، ۱۹۶۵ء، ص ۴۵۶

۶۔ فتح محمد ملک، (منظور عارف آزادی انسان کا نغمہ گر)، تحسین و تردید، اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، ص ۱۳۴

۷۔ منظور عارف، اقبال اور مسئلہ جبر و قدر، روزنامہ امروز، لاہور

۸۔ فارغ بخاری، ''ادبیاتِ سرحد''، جلد سوم، ۱۹۵۳ء، ص ۵۷۲

۹۔ فتح محمد ملک، (منظور عارف آزادی انسان کا نغمہ گر)، تحسین و تردید، اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، ص ۱۳۴

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ ''لہر لہر دریا''، مطبوعات لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۱۴

۱۱۔ منظور عارف کی نظمیہ شاعری، ''ادبی و ثقافتی اشاعت'' روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی، مؤرخہ ۲۰ نومبر، ۱۹۸۹ء

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ لہر لہر دریا، ص۔ ۱۵۔ ۶

۱۳۔ جمیل ملک، منظور عارف کی نظمیہ شاعری، خصوصی ادبی اشاعت روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی، ۲۷ نومبر، ۱۹۸۹ء